ضیاء الحسن *

اردو ادیبوں کا فطرت سے بدلتا ہوا تعلق: چار صدیوں کے تناظر میں

انسانی تاریخ میں بعض واقعات اتنی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں کہ ہم تاریخ کو ان کے حوالے سے دیکھتے ہیں، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت جس کے بعد تاریخ قبل مسیح اور بعد مسیح میں تقسیم کر کے دیکھی جانے لگی، یا ہجرت نبوی ﷺ جس کے بعد مسلمانوں نے دنیا کو ہجرت سے قبل اور بعد کی دنیا میں تقسیم کر دیا، یا انقلاب فرانس جس نے جدید یورپ کی بنیاد رکھی۔ اب تک کی انسانی تاریخ کا اہم ترین واقعہ یورپ کا صنعتی انقلاب ہے جس کے بعد جدید دنیا کا خاکہ ابھرنا شروع ہوا، اس جدید دنیا کا خاکہ جسے ہم آج گلوبل ولیج کہہ رہے ہیں۔ یہ انقلاب اپنے جلو میں بعض نعمتیں اور بعض لعنتیں لے کر آیا۔ اس انقلاب کی سب سے بڑی نعمت انسانی ذہن و علم کی بے پناہ ترقی ہے جس نے انسان پر کائناتوں کے در کھول دیے۔ اس انقلاب کی سب سے بڑی لعنت اس ذہن و علم سے پیدا شدہ ٹیکنالوجی کی خرید و فروخت ہے۔

صنعتی انقلاب سے قبل دنیا اپنے فطری ماحول کے ساتھ ایک پُرمسرت دور میں نظر آتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس دنیا میں بھی انسان نے ظلم کا رویہ روا رکھا لیکن اس وقت اس کی بہیمانہ قوتیں لامحدود نہیں تھیں اور اس کے ظالمانہ ذرائع بہت محدود تھے۔ سترھویں صدی سے دنیا کی صورتحال بدلنا شروع ہوئی لیکن آج فطرت جس عظیم اور وسیع بربادی کا شکار ہے، اس کا آغاز بیسویں صدی میں ٹیکنالوجی کے تاجرانہ پھیلاؤ کے ساتھ ہوا۔

انیسویں صدی کے اواخر تک انسان کے حیوانی تشدد کی زد میں اس کا ماحول نہیں آیا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل سے لے کر آج ۲۰۱۴ء تک انسان کے علم کا سفر جوں جوں آگے بڑھا، انسان کی ذات سے اس کے ماحول کو شدید ترین خطرات لاحق ہوتے گئے، یہاں تک کہ آج تمام دنیا کے ماحولیاتی سائنس دان یہ کہہ رہے ہیں کہ ماحولیاتی آلودگی کا خطرہ نیوکلیائی بم سے زیادہ خطرناک ہو چکا ہے۔

بیسویں صدی میں انسان کے عمل نے ثابت کیا ہے کہ دنیا کے خطرناک ترین جانور بھی انسان کے سامنے بہت معصوم اور بے ضرر ہیں۔ انسان نے اتنے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے وسائل ایجاد کیے کہ اس کے سامنے انیسویں صدی تک کی سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہے۔ انسان نے دنیا کے توازن کو برباد کرنے کے کئی طریقے ایجاد کیے ہیں جن میں سرِفہرست تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں۔ دنیا کے چند انسان ابتدائی تاریخ سے ہی طاقت اور اختیار کے حصول کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ تمام تباہی اور قتل و غارت گری اس خواہشِ اقتدار کی وجہ سے ہوئی ہے، لیکن ابتدائی انسان کے ہتھیار ایسے نہیں تھے کہ پوری دنیا کے ماحول کو تباہ کر سکیں۔ اگر چہ بارود کی ایجاد نے تباہی کا دائرہ وسیع کیا لیکن بیسویں صدی میں یہ دائرہ بہت وسیع ہوا۔ چند انسانوں کے اقتدار کی خواہش پوری کرنے کے لیے اس کے آلۂ کار انسانوں نے نئے نئے فلسفے تراشے، حب الوطنی اور قومی تفاخر کے نظریات پیدا کیے، مذاہب کو ان کی خواہشات کے مطابق تبدیل کیا اور ان کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔

سائنس دان ان کے لیے ایجادات کرتے ہیں، ماہرین ٹیکنالوجی ان کے لیے بڑی بڑی مشینیں بناتے ہیں اور اس انڈسٹری کے دھویں سے فضا اور کیمیاوی مادوں سے زیرِ زمین پانی زہر آلود ہو رہا ہے۔ ہم یہ زہر نگلتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ ٹشو پیپر لے کر ہم نے اپنے لیے موت خریدی ہے۔ زیرِ زمین ایٹمی دھماکوں سے زمین تہ و بالا ہوتی ہے، سمندروں میں ایٹمی دھماکوں سے سمندری دنیا برباد ہوتی ہے لیکن چونکہ ہماری بقا کو فوری خطرہ لاحق نہیں ہے، اس لیے ہم خاموش بیٹھے ہیں اور ان مٹھی بھر انسانوں کو من مانی کی اجازت دے رکھی ہے۔ دنیا میں بے شمار قسم کی مخلوقات ختم ہو چکی ہیں، لاتعداد کو بقا کا خطرہ لاحق ہے اور ہم چپ ہیں۔ انھوں نے پہلی جنگِ عظیم، دوسری جنگِ عظیم اور ۹۰ء سے تیسری غیر اعلانیہ جنگِ عظیم شروع کر رکھی ہے اور ہم چپ ہیں کہ ابھی ہم محفوظ ہیں۔ ہم کب سمجھیں گے کہ آج ہم محفوظ ہیں لیکن ہماری بقا کو خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔ اگر ہم آج بھی

خاموش رہے تو کل ہم نہیں رہیں گے۔

ہم خاموش ہیں لیکن ہمارا ادیب خاموش نہیں ہے۔ دنیا بھر کے ادب میں انسان اور اس کی دنیا کو لاحق خطرات اور مسائل کو مسلسل موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔ ابتدائی ادب میں آج کے مقابل کم ضرر مسائل تھے، سوانھی کا ذکر ہے۔ آج کا ادب دنیا بھر میں دنیا کی بقا کا سوال اٹھا رہا ہے۔ اردو ادیب بھی دنیا بھر کے ادیبوں کی طرح فطرت پرست اور انسان پرست رہا ہے۔ اگر ہم ابتدائی اردو ادب کو دیکھیں تو ہمیں اس میں فطرت اور انسان کے حوالے سے اور طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی زندگی کے مطابق اردو ادیبوں کے موضوعات بھی بدلتے رہے ہیں۔

اردو زبان کے ابتدائی نقوش شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئے۔ یہ عمل آٹھویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی تک مسلسل وقوع پذیر ہوتا رہا اور اردو زبان کی تشکیل ہوتی رہی۔ اگرچہ گیارھویں بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کی فارسی تصنیفات میں ہندی اثرات ملتے ہیں لیکن باقاعدہ شاعری سولھویں صدی سے ملتی ہے۔ وجہی، قلی قطب شاہ اور ملا غواصی سے آغاز ہونے والی اردو شاعری کی باقاعدہ روایت ولیؔ کی شاعری میں آ کر خالص ادبی شکل اختیار کرتی ہے۔ ولیؔ نے اس زبان میں شاعری کی جو آج بھی مستعمل ہے۔ اردو شاعری کے پس منظر میں دو تہذیبیں اور دو شعری روایتیں کارفرما ہیں۔ ایک ہندی شاعری کی روایت اور دوسری فارسی شاعری کی روایت۔ دونوں مشرقی شاعری کی روایتیں ہیں اور ان میں انسان دوستی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اردو شاعری کی روایت فی الاصل صوفیانہ تجربے سے ظہور پذیر ہوئی۔ اٹھارویں صدی تک ہندوستان کا معاشرہ بھگتوں اور صوفیوں کے افکار و کردار کے زیر اثر تھا، چنانچہ اس معاشرے میں تخلیق ہونے والی تمام زبانوں کی شاعری پر صوفیانہ افکار کے اثرات گہرے ہیں۔ صوفیا کے سامنے تین بنیادی سوالات ہوتے ہیں، انسان کیا ہے، خدا کیا ہے اور کائنات کیا ہے اور ان کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ اردو شاعروں کی تربیت میں بھی یہ تینوں سوالات کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات صوفیانہ اور مذہبی ادب دونوں میں ایک ہی ہیں کیونکہ دونوں کا فکری منبع قرآن ہے۔ اسلام اور اس سے پہلے کے تمام وحدانیت پرست ادیان میں خدا کو مرکزیت حاصل ہے جس نے انسان اور کائنات کو پیدا کیا۔ وحدت الوجودی فکر کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس نے اپنے وجود سے اس کائنات کو پیدا کیا، سو جو کچھ بھی ہے

اس وجودِ واحد سے پھوٹا ہے۔ گویا ذرّے سے آفتاب تک ہر شے خدا سے وجود پذیر ہوئی ہے، سو تمام عناصر الگ الگ وجود رکھنے کے باوجود ایک ہیں کیونکہ وجودِ مطلق کا حصہ ہیں ۔اسی لیے انسان کا خدا اور کائنات سے محبت کا تعلق ہے ۔اردو شاعری میں محبت کے اس تعلق کو عشق کے استعارے میں پیش کیا گیا ہے ۔اس شاعری میں عشق وہ قوت ہے جو نظامِ کائنات کو متحرک رکھتی ہے۔ عشق ایک نظریۂ حیات ہے جس کا مرکز محبوبِ حقیقی یعنی خداوند کریم ہے۔ عشق کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب سے محبت کی جائے اور اس سے متعلق ہر شے سے بھی محبت کی جائے ۔ چونکہ کائنات محبوب کے وجود سے تخلیق ہوئی ہے، اس لیے اردو شاعروں کے نزدیک اسے بھی محبوب کا درجہ حاصل ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں فطرت کے استعارے فراوانی سے استعمال ہوئے ہیں ۔اردو شاعری میں محبوب کا ایک استعارہ گل ہے ۔محبوب کا قد سرو جیسا ہے، آنکھیں نرگس جیسی، ہونٹ پھول کی پتیوں جیسے، بال گھٹاؤں جیسے، چال مور جیسی ۔عاشق کے لیے بلبل کا استعارہ یا پتنگے کا استعارہ استعمال ہوا ہے ۔یہ غزل کا علامتی نظام ہے کیونکہ غزل دو مصرعوں کی صنف ہے جس میں علامات کے ذریعے ہی بات ہو سکتی ہے ۔دوسری اہم صنف مثنوی ہے ۔اردو کی بیشتر مثنویاں عشقیہ قصوں پر مشتمل ہیں جن میں محبوب ہمیشہ فطرت کے عناصر کے درمیان ملتا ہے، چنانچہ فطرت کے حسن میں رنگا ہوا ہے ۔مثنویوں کی منظر نگاری جدید شاعری میں کم سے کم ہوتی گئی کیونکہ بعد میں شاعری کا تعلق فطرت سے اس طرح قائم نہ رہ سکا ۔جدید زندگی نے جس تیزی سے فطرت کو ننگا ہے اور بدصورت بنایا ہے، اس کے نتیجے میں اردو شاعری میں فطرت نگاری کے بجائے فطرت سے ہمدردی کا رویہ ابھرا۔

قدیم دکنی شاعری میں فطرت کے یہ استعارے بھرے پڑے ہیں ۔فطرت سے محبت کا یہ جذبہ محبوب کے حسن میں منتقل ہو گیا ہے ۔اس سراپا حسن شاعری میں سے حسن شوقی کی ایک غزل دیکھیے اور محسوس کیجیے کہ انسان اور فطرت کس طرح ایک دوسرے میں گھلے ملے ہوئے ہیں ۔سترھویں صدی کے اس شاعر کی سراپا نگاری فطرت سے ہم آہنگ ہے:

در بزمِ ماہ رویاں خورشید ہے سریجن
میں شمع سوں جلوں گی وہ انجمن کہاں ہے
اے بادِ نوبہاری گر تو گذر کرے گا
گلزار تے خبر لیا او یاسمن کہاں ہے

از ہند تا خراساں خوشبو کیا ہے عالم
تس شاہِ مشکبو کا گل پیرہن کہاں ہے[۱]

حسن شوقی کی غزل کی اس خصوصیت کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

حسن شوقی کی غزل میں جسم کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ وصال کی خوشبو اڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ موتی سے دانت، کلیوں جیسے ہونٹ، کٹھن ہیرے کی طرح حل، سروقدی، مکھ نور کا دریا، دلِ عشق کو پھونک دینے والا سراپا اُس کی غزل کے مخصوص موضوعات ہیں۔[۲]

اسی طرح قلی قطب شاہ کی شاعری میں بھی محبوب، عاشق اور محبت کی ساری فضا فطرت سے ہم آہنگ نظر آتی ہے اور صرف قلی قطب شاہ ہی کیا، اس دور کی ساری شاعری میں فطرت کا حسن انسانی حسن میں اس طرح گھل مل جاتا ہے جیسے پوری کائنات ہم آغوش ہو رہی ہو:

رُوت آیا کلیاں کا ہوا راج
ہری ڈال سر پھولاں کے تاج
ہیں پھول دیسے ستارے اسماں
اس زمانے کی پری پدمنی آئے آج
چودھر گرجت ہوں میٹھوں برست
عشق کے چمنے چمن موراں کا ہے راج[۳]

اٹھارویں صدی عیسوی کلاسیکی شاعری کے عروج کی صدی ہے۔ دبستان دلی اور دبستانِ لکھنؤ کا تعلق اسی صدی سے ہے۔ اردو شاعری کا عہد زریں یعنی میر و سودا کا دور اسی صدی میں رہا۔ یہ صدی سیاسی، معاشی اور معاشرتی ابتری لیکن ہند اسلامی تہذیب کے کمال کی صدی ہے۔ اسی صدی میں احمد شاہ ابدالی نے مغل سلطنت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی، سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کو شکست دے کر انگریزوں نے اقتدار کا با قاعدہ آغاز کیا۔ انگریزی اقتدار کے نتیجے میں نیا صنعتی معاشرہ پہلے کلکتہ میں قائم ہوا لیکن اس کے اثرات انیسویں صدی میں ظاہر ہوئے۔ اس صدی میں بھی تمام اصناف ادب میں جو کائنات نظر آتی ہے، بے حد مربوط ہے۔ غزل کے شعر دیکھیے:

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے[۴]

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میر
بلبل پکاری دور سے صاحب پرے پرے[۵]

دونوں شعروں میں دیگر جانداروں کو انسانوں کے استعارے کے طور پر برتا گیا ہے گویا پورا معاشرہ انسانوں، جانوروں اور نباتات سے مل کر وجود پذیر ہوا ہے۔ نظیر اکبر آبادی تو اپنی ان نظموں کے لیے مشہور ہیں جن میں آدمی، گھر، گلیاں، ہوا، بارش، کیچڑ، چرند، پرندے، پودے، پھل، سبزیاں پورا ماحول ایک ڈور میں بندھا ہوا ہے۔ اس دور کی دیگر اصناف ادب قصیدہ، مرثیہ، مثنوی میں بھی ماحول زندہ اور متحرک ہے۔ ہر مثنوی میں باغ، صحرا، دریا، جنگل کے مناظر فراواں ہیں۔ قصیدوں کی تشبیب ہو یا مرثیوں کا چہرہ فطرت اور ماحول کے بیان سے آغاز ہوتا ہے۔ اس دور کی شاعری کے مجموعی مزاج میں فطرت اور ماحول سے محبت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ اس لیے طوالت سے بچنے کے لیے میں نے مثال کے طور پر بس میر کے دو شعر پیش کیے ہیں، ورنہ اس دور کے کسی بھی شاعر کی کسی بھی صنف کی شاعری کو دیکھیں تو یہ رویہ بنیادی رویے کے طور پر ابھرتا ہے۔

اردو کلاسیکی شاعری کا دور انیسویں صدی کے نصفِ اوّل تک رہا۔ غالب پہلا شاعر ہے جس کی شاعری میں صنعتی معاشرت کی ابتدائی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ انسانوں اور فطرت کے ساتھ محبت کا جو رویہ قبل ازیں اردو شاعری میں نظر آتا ہے، اس دور میں کم ہو جاتا ہے اور اس کے بدلے نئے زر پرستانہ رویے ابھرنے لگتے ہیں۔ وہ صارفی معاشرہ جو آج اپنے عروج پر نظر آتا ہے، اس کی ابتدا انیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں ہی ہو گئی تھی۔ پہلے فطرت سے انسانی روح کا رشتہ استوار تھا، اب فطرت برائے فروخت ہو گئی۔ تمام رشتے دولت کے حصول سے منسلک ہو گئے۔ فطرت کے عناصر حسن افروزی کے بجائے معاشی جبر کا شکار ہو گئے۔ ماحول کی بدصورتی کا آغاز ہوا۔ ان بدلتے رویوں کی جھلک غالب کے دو شعروں میں دیکھیے:

سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گل چیں
مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

غارتِ گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے[۶]

پہلا شعر طنزیہ ہے جس میں پرندے کو خوش خبری سنائی گئی ہے کہ باغ میں صیاد نہیں ہے بلکہ پھول توڑنے والا ہے، اس لیے اس نے پرندے کو پھولوں کی ٹوکری میں قید کیا ہے، اگر صیاد ہوتا تو پنجرے میں بند کرتا۔ اس شعر کے دو کردار شکاری اور گل چیں اردو شاعری میں پہلے نہیں تھے۔ یہ نئے کردار ہیں جو زندگی کی تبدیلی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ ہوسِ زر کی وجہ سے پھول بازار میں بکنے کے لیے آ گئے ہیں۔ پہلے شعر کا گل چیں وہ کردار ہے جو باغ سے پھول چنتا ہے اور بازار میں فروخت کرتا ہے اور صیاد پرندے پکڑتا ہے اور بازار میں فروخت کرتا ہے۔ پھول، پرندے اور دیگر عناصرِ فطرت زندگی میں حسن پیدا کرتے تھے، اب بازار میں فروخت کے لیے رہ گئے ہیں۔ پہلے بلبل عاشق تھا، کبوتر قاصد تھا، اب بازار کی جنس ہیں۔

اب ذرا دوسرے شعر کے علامتی مفاہیم دیکھیے۔ گل صرف پھول ہی نہیں ہے بلکہ محبوب کا استعارہ ہے اور محبوب انسان بھی ہے اور خدا بھی۔ گویا شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ ہوسِ زر نے پھول، محبوب اور خدا سب کو قابلِ فروخت بنا دیا ہے۔ اس شعر کی فضا ملال اور افسوس کی ہے یعنی اپنے لہجے سے شاعر اس غیر انسانی رویے کی مذمت کر رہا ہے۔

غالب پہلا اردو شاعر ہے جس کی شاعری میں انسان اور اس کے ماحول میں مغائرت نظر آتی ہے اور اس کی شاعری میں یہ عنصر قیامِ کلکتہ کے بعد پیدا ہوا جب اس نے نئے صنعتی معاشرے کو جو انیسویں صدی کے وسط تک کلکتہ میں مستحکم ہو چکا تھا، دیکھا۔ اسی لیے غالب کو اردو کا آخری کلاسیکی اور پہلا جدید شاعر کہا جاتا ہے کہ اس کی شاعری میں کلاسیکی معاشرے کی آخری جھلکیاں اور نئے صنعتی معاشرے کے اوّلین نقوش ملتے ہیں۔ غالب کے بعد اردو ادب کلاسیکی دور سے جدید دور میں داخل ہو جاتا ہے۔

جدید اردو ادب کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہوا۔ علی گڑھ تحریک، انجمن پنجاب، سر سید کا سفرِ انگلستان، انجمن پنجاب کے مشاعرے اور حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کی اشاعت نے جدید ادب کی راہیں ہموار کیں۔ سر سید تحریک نے نیچرل شاعری کا مطالبہ کیا اور انجمن پنجاب کے مشاعروں سے اس شاعری کے ابتدائی نمونے مہیا ہوئے۔ یہ فی الاصل کلاسیکی شاعری کے نظامِ علامات سے نکلنے اور براہِ راست بیانیہ اختیار کرنے کی تحریک تھی۔ پہلے انسان اپنے ماحول سے ہم آہنگ تھا اور اب ماحول کو ایک مختلف عنصر سمجھ کر دیکھا

جانے لگا۔یہ ماحول سے مغائرت کی ابتدا تھی۔بیسویں صدی کے اوائل میں مغربی ادب کے زیرِ اثر اس مغائرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔سر سید اور ان کے ساتھیوں نے اپنے مضامین، شاعری اور افسانوی نثر میں جس اخلاقیات کا پرچار کیا، وہ بھی سطحی تھی اور ماضی کی اخلاقیات سے مختلف تھی جس میں محبت، انسانی شرف کا احساس، صداقت، خیر اور حسن کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور جس کی وجہ سے کائنات مختلف اور متنوع عناصر پر مشتمل نہیں تھی بلکہ ایک وجودِ واحد تھی۔بیسویں صدی کے ربع اوّل میں اقبال سمیت اردو کے تمام ادیب فطرت پرستی کی اس تحریک سے متاثر ہوئے۔اقبال واحد شاعر ہیں جنھوں نے اس سطحی فطرت پرستی کو پہچانا اور محسوس کیا کہ اصل مسئلہ انسان کی گم شدگی ہے۔اگر اس انسان کو تلاش کر لیا جائے جو فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کر سکتا ہو، تو فطرت اور ماحول سے ٹوٹا ہوا ربط بحال ہو سکتا ہے۔اقبال نے اس آئیڈیل انسان کو مردِ مومن کہا۔یہ وہ انسان ہے جو سرمایہ داری نظام سے قبل کی انسانی تاریخوں میں وقتاً فوقتاً رونما ہوتا رہا۔یہ وہ انسان تھا جو ذاتی زندگی گذارنے کے بجائے اجتماعی زندگی پر یقین رکھتا تھا، ایسی اجتماعی زندگی جس میں تمام انسان اور اس کے ارد گرد پھیلی زندگی شامل تھی۔اقبال کے بعد راشد کی شاعری میں اس انسان کی آرزومندی ملتی ہے۔اقبال کی شاعری میں کہیں براہِ راست بیانیہ بھی ملتا ہے۔ان کی شاعری میں فرنگ اسی صنعتی معاشرت اور اس سے پیدا ہونے والے سرمایہ داری نظام اور اس کے نظامِ سیاست و جمہوریت کے لیے استعمال ہوا:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات [۷]

بیسویں صدی کے ساتھ ہی اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز بھی ہو گیا۔شاعری کی زبان علامتوں اور استعاروں کی زبان ہے جبکہ افسانہ بیانیہ اسلوب میں لکھا جاتا ہے۔اس صنف میں شاعری کی نسبت سپیس (space) زیادہ ہے، اس لیے مسائل کو وضاحت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔دنیا بھر میں فکشن صنعتی نظام اور اس سے پیدا ہونے والی شہری معاشرت کے ساتھ وجود میں آیا اور اس زندگی کو پیش کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔اردو افسانے کے پہلے دور کے نمایاں ترین افسانہ نگار پریم چند ہیں جو دیہاتی زندگی اور اس کو درپیش مسائل کے بیان کے لیے معروف ہیں۔ان کے افسانوں میں جا بجا فطرت اور ماحول کے مسائل آئے ہیں جن سے محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنے ماحول سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہے۔بیسویں صدی کے نصف اوّل کے اردو افسانہ

نگاروں نے انسان کی اپنے ماحول سے اس مغائرت کی تصویر کشی کی ہے جس میں گندی گلیاں، مکان، کمرے، دھواں، شور، تنہائی، بے گانگی، بے رغبتی، بے تعلقی، بھوک، افلاس، بیماریاں ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ نئے نظام نے کس طرح انسانی زندگی اور اس کے ماحول کو متاثر کیا ہے مثلاً پریم چند کے معروف افسانے ''پوس کی رات'' کا ہلکو آخر میں جس طرح اپنی کھیتی سے بے تعلق نظر آتا ہے، دراصل یہ بے تعلقی اس کی پورے معاشرے اور ماحول سے بے تعلقی ہے لیکن اس میں ایک تعلق یعنی اپنے کتے جبرے سے تعلق ابھی موجود ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جوں جوں ہم اکیسویں صدی کے قریب ہوتے گئے ہیں، صنعتی نظام کا پھیلاؤ فطرت میں زیادہ سے زیادہ دخل اندازی، بگاڑ اور تباہی کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ اب ماحول سے مغائرت ماحول سے مخاصمت اور مبارزت میں بدل جاتی ہے۔ یہ وہ عہد ہے جب بستیوں اور قصبوں کو ڈیم کھاتے جارہے ہیں، کھیتوں میں شہر گھس گئے، صنعتیں لگ گئیں۔ شہر کینسر کی طرح پھیلتے چمنیوں اور سائلنسروں سے نکلنے والے دھوئیں نے دیگر مخلوقات کی طرح انسان کو بھی اپنا نشانہ بنایا۔ پرندے شہروں سے ہجرت کر گئے۔ فلیٹس اور چھوٹے گھروں میں پھول پودے پرندے عنقا ہوگئے۔ ساٹھ کی دہائی میں جدیدیت کی تحریک نے ادیبوں کو شہری معاشرت کی عکاسی پر مائل کیا۔ اس دور کی شاعری اور افسانے میں فطرت کی بربادی ایک مستقل موضوع بن گئی۔ مجید امجد کی نظم توسیعِ شہر کی ابتدائی لائنیں دیکھیں:

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار[۸]

یوں تو اس دور کے ہر شاعر کی شاعری میں ہمیں فطرت اور ماحول کی بربادی کے مناظر ملتے ہیں اور ان پر دکھ کا اظہار بھی ملتا ہے لیکن مجید امجد کی شاعری میں اسے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی نظموں میں ''پژمردہ پتیاں''، ''سوکھا تنہا پتا''، ''بہار کی چڑیا''، ''ہری بھری فصلو''، ''زینیا'' اور آخری دور کی بیشتر نظموں میں یہ موضوع مسلسل آیا ہے۔ ان کی نظم ''اے ری چڑیا'' کی یہ لائنیں دیکھیں:

اپنی پیت پہ یوں مت ریجھ، خبر ہے، باہر
تجھ کو یوں چمکارنے والوں میں ہے اک جگ تیرا بیری،

چڑیا، اے ری چڑیا[9]

جدید اردو افسانے میں یہ موضوع زیادہ وضاحت سے آیا ہے۔ خالدہ حسین کا شمار ساٹھ کی دہائی میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے کئی افسانوں میں ضمنی طور پر ماحول میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اور ایٹمی دھماکوں سے موسموں میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر آیا ہے۔ ان کا مشہور ترین افسانہ ''سواری'' اس حوالے سے بہت اہم ہے۔ اس افسانے پر مجموعی طور پر تباہی، خوف اور دہشت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ اس کے بنیادی کرداروں میں پراسراریت ہے اور اس پراسراریت کے پردے میں انھوں نے ایک طرح سے پیش گوئی کی ہے کہ یہ ماحولیاتی تبدیلیاں ایک بڑی اور مکمل تباہی کا باعث بن سکتی ہیں۔

انور سجاد علامتی افسانہ نگار ہیں۔ ان کی علامتوں میں زوال پذیر انسانی صورتِ حال کے پس منظر میں یہی فطرت دشمنی نظر آتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں ان تمام افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے جن کے افسانوں میں نمایاں طور پر یا پس منظر میں تباہی کے دہانے کی طرف بڑھتی ہماری جدید دنیا اپنی تمام تباہ کارانہ وجوہات کے ساتھ نظر آتی ہے۔ ان وجوہات میں سرفہرست ایٹمی تجربات ہیں۔ میں اپنے مضمون کا خاتمہ حسن منظر کے دو تین افسانوں پر گفتگو سے کروں۔ اگرچہ رفیق حسین نے حیوانی کرداروں کے ذریعے انسان کی اہمیت اور ماحول دشمنی کو نمایاں کیا ہے لیکن حسن کا منظر کا رویہ زیادہ تجزیاتی ہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور سائنس کے طالب علم ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں میں موجودہ دنیا کا نقشہ زیادہ بہتر طور پر پیش ہوا ہے۔ انھوں نے بعض ایسے موضوعات کو چھیڑا ہے جن کی طرف عام طور پر ہمارے افسانہ نگاروں کی نظر نہیں جاتی۔ ان افسانوں میں زیادہ واضح طور پر موجودہ تباہی و بربادی کے پیچھے انسان کے تاجرانہ مقاصد کارفرما نظر آتے ہیں۔ افسانہ ''ایک اور آدمی'' کا موضوع کیمرون کے جنگلات سے لائی ہوئی ایک خوبصورت مادہ گوریلا وکٹوریا ہے۔ ماہرین جنگلات اس سے گوریلاؤں کی ایک خوبصورت نسل پیدا کرنا چاہتے ہیں جس کا مقصد انھیں دوسرے ممالک کو بیچ کر پیسہ کمانا ہے۔ اس کوشش میں وہ سارے تجربات کرتے ہیں جو انسانوں کے لیے کیے گئے تھے۔ جب وہ فطری طور پر حاملہ نہیں ہو پاتی تو اسے آپریشن کے ذریعے حاملہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بالآخر وہ انسانی نطفے سے حاملہ ہو جاتی ہے اور ایک انسان نما جانور کو جنم دیتی ہے جسے دیکھ کر وہ صدمے سے مر جاتی ہے۔ اس افسانے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی ساری اخلاقیات بس دولت کا حصول ہے اور اس کے

لیے وہ بڑے سے بڑا جرم کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہاں وہ مادہ گوریلا جدید انسان سے زیادہ انسانی صفات کی حامل اور حیادار نظر آتی ہے جسے جدید بے حیا انسان تجارتی مقاصد کے لیے ذہنی اور روحانی صدمات سے دوچار کرتا ہے جو اس کی موت پر منتج ہوتے ہیں۔

ان کا افسانہ ''فائل نمبر ۷، جنگلات، جلد ۳'' بھی ایسا ہی طنزیہ افسانہ ہے جس میں ماحول دشمنی بہت واضح ہے۔ اس افسانے کی چند لائنیں دیکھیں:

> ڈیئر مسٹر روجا! آپ کے ۱۱۱ گست ۱۹۶۴ء کے نیم سرکاری مراسلے کے حوالے سے جو مسٹر بون کولن صوبائی انجینئر للکوجا کے نام تھا، آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ کے صاحبزادے مسٹر ہیمین روجر ایڈورڈ کے جنگلات میں دسمبر ۱۹۶۴ء کی کسی تاریخ کو ۲ نر بالغ ہاتھی شکار کر سکتے ہیں، لائسنس اور ۳۵ پونڈ کی رسید اجازت نامے کے ساتھ منسلک ہے۔[۱۰]

یہ افسانہ درخواست کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور افریقہ میں جانور کشی کے بارے میں منافقانہ اور غیر انسانی رویے کی عکاسی کرتا ہے جس میں ایک ہاتھی کے قتل کی قیمت صرف پندرہ پونڈ ہے۔

اس حوالے سے حسن منظر کا شاندار افسانہ ''زمین کا نوحہ'' ہے جس میں انھوں نے انسان کے فطری نظام میں انسان کی دخل اندازی کے نتیجے میں نوعِ انسانی کو لاحق خطرات کو موضوع بنایا ہے۔ لڑکا پیدا کرنے کے جنون میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب لڑکیاں ناپید ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ تیسری نسل کے لڑکے، لڑکی کا ذکر ایسے سنتے جیسے یہ کوئی قصہ کہانی ہو۔

> ایسے ہی ایک موقع پر ایک بوڑھے نے کہا ''ہم جب تمھاری عمر کے تھے اور ہمارے ماں باپ اپنے ملکوں کی خوبصورتی کا ذکر کرتے تھے جہاں سے وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے، وہاں کے دریاؤں کا، گھاس ڈھکی پہاڑیوں کا اور جنگلوں کا اور ان میں بسنے والے جانوروں کا تو ہم بھی ہنستے تھے کیونکہ ہمیں بھی یقین نہیں آتا تھا۔[۱۱]

اس پیراگراف سے پتا چلتا ہے کہ ان تجربات کا پہلا ہدف فطرت اور ماحول تھا۔ افسانہ نگار کے لہجے میں طنز ہے لیکن بیانیہ بظاہر معروضی بیان معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان کے فن کا کمال ہے کہ طنزیہ اسلوب اختیار کیے بغیر شدید طنز سے کام لیا ہے۔ یہ افسانے اس سائنس اور ٹیکنالوجی کا پول کھولتے ہیں جن سے عام آدمی مرعوب ہوتا ہے اور اس کے خلاف بات کرتے ہوئے ڈرتا ہے کہ کہیں جاہل نہ سمجھا جائے لیکن افسانہ نگار سچا اور کھرا انسان

ہوتا ہے اور زندگی کو جیسا دیکھتا ہے، بیان بھی کر دیتا ہے۔

عالمی ادارۂ صحت ایسی دوا بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے جس سے عورت لڑکی پیدا کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتی ہے لیکن اس دوا کے استعمال کے لیے انھیں کوئی عورت میسر نہیں آتی۔ آخر ایک دور دراز علاقے میں ایک عورت کا سراغ ملتا ہے لیکن اس عورت کا خاوند دوا استعمال کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ آپ کو بنی نوع انسان کی فکر کب سے لاحق ہو گئی ہے:

> آپ نے کب میری دنیا کی پروا کی جسے میں چاہتا تھا کہ آپ اس کے حال پر چھوڑ دیں، ہر طرح کی گندگی سے پاک لیکن آپ نے اسے دھویں، نا بکاری، نا بکار راکھ اور اپنے تجربات سے تباہ کر کے رکھ دیا۔ میرا اسکول، میرا گاؤں، میرے دونوں لڑکے کہاں گئے؟ سب آپ کی نذر ہو گئے۔ جتنے کی آپ کو ضرورت نہیں تھی، اس سے زیادہ کی آپ کو ہوس تھی۔ آپ نے سمندروں اور پہاڑوں تک کو نہیں چھوڑا۔ ان میں بھی دشمنوں کی حرکات کو سونگھ لینے والے ایٹمی آلات نصب کیے۔[۱۲]

اردو شاعروں اور ادیبوں نے گذشتہ ساٹھ سال کے دوران میں ان ظالمانہ رویوں کے خلاف لکھا ہے جس کے نتیجے میں دنیا کا فطری ماحول برباد ہوا ہے، صرف اردو ادیبوں نے ہی نہیں، گذشتہ نصف صدی میں دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں لکھنے والے ادیبوں کا ایک اہم موضوع یہ غیر انسانی رویہ رہا ہے لیکن ادب ایمان اور اعتقاد نہیں ہوتا۔ اس ساری غیر انسانی صورتِ حال اور سائنسی نظریات کے باوجود آج بھی انسان خدا کے تصور سے وابستہ ہے اور مذہب سے جڑا ہوا۔ اگر آج دنیا بھر کے مذہبی رہنما انسان کی وسیع اکثریت کو باور کروا دیں کہ ماحولیات کو نقصان پہنچانے والی یہ تمام سرگرمیاں غیر انسانی اور خدا کی ناپسندیدہ ہیں اور ان کو روکنا ہر انسان کا فرض ہے تو شاید اس کا تدارک ممکن ہو سکے۔

حوالہ جات

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اوّل (لاہور: مجلس ترقی ادب، ستمبر ۲۰۰۸)، ص ۲۹۲۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۹۳۔

۳۔ ایضاً، ص ۳۱۲۔

۴۔ میر محمد تقی میر، کلیات میر، جلد چہارم (لاہور: مجلس ترقی ادب، جون ۲۰۰۶ء)، ص ۱۳۳۔

۵۔ میر محمد تقی میر، کلیات میر، جلد سوم (لاہور: مجلس ترقی ادب، جون ۱۹۹۲ء)، ص ۳۷۴۔

۶۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب، دیوان غالب نسخۂ عرشی (لاہور: مجلس ترقی ادب، جون ۱۹۹۲ء)، ص ۲۳۹، ۳۰۸۔

۷۔ علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اشاعت ششم ۲۰۰۴ء)، ص ۴۳۵۔

۸۔ مجید امجد، کلیات مجید امجد مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ستمبر ۲۰۰۳ء)، ص ۳۵۲۔

۹۔ ایضاً، ص ۵۱۰۔

۱۰۔ حسن منظر، ندیدی (کراچی: شہرزاد، جولائی ۱۹۸۲ء)، ص ۹۔

۱۱۔ حسن منظر، ریاتی (کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۷۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۱۔

مآخذ

اقبال، علامہ محمد۔ کلیاتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اشاعت ششم ۲۰۰۴ء۔

امجد، مجید۔ کلیات مجید امجد۔ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ستمبر ۲۰۰۳ء۔

جالبی، ڈاکٹر جمیل۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اوّل۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ستمبر ۲۰۰۸۔

غالب، مرزا اسد اللہ خاں۔ دیوان غالب نسخۂ عرشی۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، جون ۱۹۹۲ء۔

منظر، حسن۔ ریاتی۔ کراچی: شہرزاد ۲۰۰۸ء۔

______۔ ندیدی۔ کراچی: شہرزاد، جولائی ۱۹۸۲ء۔

میر، میر محمد تقی۔ کلیاتِ میر۔ جلد سوم۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، جون ۱۹۹۲ء۔

______۔ کلیاتِ میر۔ جلد چہارم۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، جون ۲۰۰۶ء۔